ڈاکٹر سید محمد مبشر رضا نقوی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ علمدار حسین کالج، ملتان

جھوک سیال: دیہی پنجاب کا ثقافتی اظہار

Abstract:

Syed Shabbir Hussain Shah, a government officer, had a passion for fiction writing. His only novel "Jhok Sayal" was published in 1972 by his widow Malika Pukhraj, a renowned singer. It sheds light on the exploitation of the native population by politicians, feudal lords, and religious figures. The novel vividly portrays the rich diversity of rural Punjabi culture. Moreover, it also explores the social and political realities of its time, providing an insightful commentary on the challenges faced by the local community.

Keywords:

Urdu Novel, Fiction, Malka Pukhraj, Rural Punjab, Feudalism, Diversity

اُردو ناول نگاری کے حوالے سے بہت سے ایسے نام ہیں کہ جنھوں نے کئی ناول لکھے تاہم انہیں پذیرائی کسی ایک ناول کی بنا پر حاصل ہوئی جبکہ اس کے برعکس ایسے ناول نگار بھی گزرے ہیں جو اپنی ایک ہی تخلیق کی وجہ سے شہرت کے آسمان پر جگمگانے لگے۔ انہی میں سے ایک سید شبیر حسین شاہ بھی ہیں جن کا ناول ''جھوک سیال'' اگرچہ ان کی وفات کے بعد ۱۹۷۲ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا لیکن اس اکلوتے ناول نے انہیں بڑے ناول نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ناول کے ابتدائیہ میں احمد ندیم قاسمی نے ''جھوک سیال'' سے متعلق لکھا ہے:

> ''منشی پریم چند کے ''گئودان'' کے بعد اسے دیہی موضوعات کے ناولوں میں سب سے اہم مقام حاصل ہوگا۔''(۱)

احمد ندیم قاسمی کے علاوہ بھی بعض ناقدین نے اسے ''گئودان'' کی روایت کا ناول کہا ہے مگر سب نے اس کے معاشی، سیاسی پہلو کو مقدم رکھتے ہوئے اس کا تجزیہ کیا ہے جبکہ یہ ناول پنجاب کے دیہی کلچر کا عکاس بھی ہے مگر اس پہلو کو زیادہ زیر بحث نہیں لایا گیا۔ اُردو ناول کی روایت میں پریم چند اک نمائندہ ناول نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں کہ جنھوں

نے پنجاب کے دیہی کلچر کو اپنے ناولوں میں جگہ دی۔ بالخصوص ''گئودان'' اس کی واضح مثال ہے اس کے ساتھ ساتھ بلونت سنگھ بھی اس قطار میں شامل ہیں۔ ہم جب پاکستانی پنجاب کے تناظر میں دیکھیں تو ''جھوک سیال'' ایک اہم ناول ہے کہ جس میں پنجاب کے دیہی کلچر کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد افضال بٹ کہتے ہیں:

> ''جھوک سیال'' میں دیہی عوام کی زندگی سے آشنائی ملتی ہے۔۔۔ پریم چند نے ہی گاؤں کے نچلے طبقے کے دکھ درد، غم خوشی اور آرزوؤں کی شکست کو موضوع بنایا تھا اور سید شبیر حسین نے بھی اسی روش کو مزید جدید رنگ میں عیاں کیا ہے۔'' (۲)

''جھوک سیال'' کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ناول نگار نے متخیلہ سے زیادہ حقیقت نگاری پر زور دیا ہے۔ سید شبیر حسین شاہ چونکہ اپنے سرکاری فرائض کی بجا آوری کے سلسلہ میں جھنگ، سمندری، اوکاڑہ اور اس کے قریبی علاقوں میں تعینات رہے لہٰذا انہیں ''جھوک سیال'' کے مختلف طبقات کو نہایت قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ یہ وہ علاقہ ہے کہ جس کے باشندوں کو مقامی زبان میں جانگلی بھی کہا جاتا ہے اور یہ علاقہ اپنی پیر پرستی اور اعتقاد کی شدت پسندی کے اعتبار سے بھی خاصا مشہور ہے۔

سید شبیر حسین شاہ نے ''جھوک سیال'' میں زیادہ تر وسطی پنجاب کے کلچر کی عکاسی کی ہے چونکہ یہ زرعی علاقہ ہے لہٰذا یہاں کے کردار بھی اسی مناسبت سے دکھائے گئے ہیں۔ پنجاب کے جاگیردارانہ کلچر میں زمیندار، جاگیردار یا سردار اپنے علاقے کا حاکم سمجھا جاتا ہے جو ادنیٰ طبقات کو اپنے زیرِ تابع رکھنا چاہتا ہے یہ طبقہ ہر طرح کے ظلم وستم سہتا ہے اپنی خواہشات کو کبھی بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا اور پھر تقدیر پر قانع ہو کر صبر وشکر سے زیادہ، جبر سے زندگی گزارتا ہے۔

شبیر حسین شاہ نے یہاں چھوٹے طبقات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے اور ناول میں کرداروں کے نام اُن کے پیشوں کے اعتبار سے رکھے ہیں جو کہ ہمارے دیہی کلچر کا انداز ہے مثلاً عابد مصلّی، خانوں پگل، رحمان موچی، شرفو نائی، صابو پاولی، دلدار کمہار، رمضو نائی، رحموں تیلی، رحمان قصائی، شاموں ترکھان، دُلّا لوہار، بہادرا ماچھی وغیرہ۔ ان ناموں سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُس علاقے میں ذات پات کی تقسیم کتنی زیادہ تھی اور لوگوں کے پیشے ہی ان کی پہچان بن گئے تھے۔ یہی پنجاب کے کلچر کا چلن ہے کہ وہ لوگوں کے اصل ناموں سے لوگ کم واقف ہوتے ہیں جبکہ اُن کی عرفیت جو کہ ان کے پیشوں سے متعلق ہوتی ہے وہی ان کی پہچان بن جاتی ہے اور اسی پہچان کے ساتھ وہ قبروں میں جا سوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں شادی بیاہ کی تقریبات اپنے مقامی رسوم ورواج اور حیثیت کے مطابق بنائی جاتی ہیں۔ ایسے طبقات جنہیں ادنیٰ یا کمیں سمجھا جاتا ہے اپنی حیثیت کے مطابق شادی کی رسم کو ادا کرتے ہیں تاہم خوشی کا اظہار صدقِ دل سے کرتے ہیں۔ سید شبیر حسین شاہ نے جھوک سیال میں شادی کی منظر کشی بہت احسن طریقے سے کی ہے اس کی وجہ وہی ہے جس کا کہ پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ انہیں مشاہدے کی سہولت حاصل تھی۔ دیہی کلچر کی مناسبت سے یہ شادیاں اپنی برادری یا ہم پیشہ لوگوں میں کی جاتی تھیں جبکہ امیروں کے لیے کسی کو بھی گھر لے آنا کوئی بُرا فعل نہیں سمجھا جاتا تھا مگر چھوٹے طبقات کو ایسا کرنے کی جسارت بھی نہ ہوتی تھی:

> ''اگر کوئی رئیس یا متمول زمیندار کسی ماچھن، کمہارن، مصلن یا میراثن کو گھر میں ڈال لیتا تو اس پر

اپنے اقربا کے سوا کسی کو اعتراض نہ تھا کیونکہ صدیوں سے کھاتے پیتے امراء، رئیس اور بڑے بڑے زمیندار کم مایہ بے حیثیت لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اپنی جاگیر سمجھتے آئے تھے مگر جہاں تک کسی ماچھن کا کمہارن سے یا تیلی کا مصلن سے بیاہے جانے کا تعلق تھا اس کی کسی صورت اور کسی شکل میں اجازت نہ تھی۔ ترکھان ترکھانی سے، لوہار لوہارن سے، نائی نائن سے اس دھرتی کا ایک ایسا ان لکھا قانون تھا جسے توڑنا تو درکنار اس کا خیال بھی محال تھا۔''(۳)

یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بالا دست طبقے کے لیے تو ذات برادری بہت زیادہ اہمیت نہیں رکھتی مگر نچلے طبقات اس طرح سوچنا بھی نہیں چاہتے کہ اُن کی ذات برادری کے علاوہ کوئی دوسرا ان کا رشتہ دار بنے۔ یہ لوگ طویل عرصے سے انہی روایات کے اسیر ہیں اور شاید اس سے چھٹکارا بھی نہیں پانا چاہتے۔ ہمیں اس پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ کسی بھی علاقے کی ثقافت محض ایک پہلو پر مبنی نہیں ہوتی بلکہ اس میں اِک ہمہ گیری ملتی ہے۔ انسانی زندگی کا ہر رنگ اس ثقافت کی تصویر میں استعمال ہوتا ہے یعنی ہر پہلو کو اس میں شامل کیا جا سکتا ہے اور اس کا تعلق اپنے سماج سے ہوتا ہے۔ بعض ثقافتی تقریبات انہی سماجی حیثیت کے مطابق منعقد کی جاتی ہیں۔ محمد نعیم ورک کا کہنا ہے:

''رسم و رواج میں سماجی حیثیت کو علامتی سطح پر ظاہر کرنے کا امکان خصوصاً اجتماعی موقعوں پر ہوتا ہے۔ اجتماعی سے یہاں مراد ایسی رسوم ہیں جن میں بڑے گروہ اِنسان حصہ لیتے ہیں۔ مثلاً محرم میں تعزیہ نکالنا ہو یا سبیل لگانی ہو۔۔۔ اس کے مقابلے میں شادی زیادہ سے زیادہ دو گروہوں پر مشتمل ہے، ایک دُلھا والے، دوسرا دُلھن والوں کا گروہ۔''(۴)

سید شبیر حسین شاہ نے دیہی پنجاب میں مقامی لوگوں کی شادی کے موقع کی بھرپور انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ یہ تصویریں ان علاقوں کے طبقات کی حقیقی تصاویر ہیں اور ان میں کوئی رنگ آمیزی شامل نہیں۔ اُنہوں نے علّو ماچھی کی شادی کے حوالے سے علّو کی تیاری کو دکھاتے ہوئے وہاں کے کلچر کو بھی دکھایا ہے:

''علّو کی آدھ بالشت داڑھی مہندی کی رنگت سے سرخ ہو رہی تھی اور سرسوں کے تیل کی مالش سے چمک اُٹھی تھی۔ سر پر خاصی بڑی ململ کی سُرخ پگڑی اور اس پر زرد پھولوں کا سہرا۔ لٹھے کی سفید قمیض، پاؤں میں بہاول پوری کھوسہ، غرضیکہ دولھا سجا بنا ہوا تھا۔''(۵)

یہ وسطی پنجاب کے مقامی لوگوں کا خاص انداز ہے کہ وہ اس ثقافت کے حوالے سے اپنی تقریبات میں تیاری کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ناول آج سے نصف صدی پہلے کا تحریر کردہ ہے تاہم اس میں موجود کردار اور اُن کا انداز آج بھی تقریباً ایسا ہی ہے اگرچہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں کمی آتی جا رہی ہے تاہم ایسے ناول اگر لکھے جائیں تو ہم اپنے ثقافتی ورثے اور مقامی رہتل کو آنے والی نسل کے لیے محفوظ کر سکتے ہیں۔

سید شبیر حسین شاہ نے ''جھوک سیال'' میں شادی کا احوال بیان کرتے ہوئے اس کی جزئیات کا بھی خیال رکھا ہے اور اُن کی منظر کشی بھی شاندار ہے۔ شادی میں نکاح کے بعد 'بِد' کا تقسیم ہونا بھی ایک لازمی امر ہے اور اس روش کی تمام طبقات پاسداری کرتے ہیں مگر اس ''بِد'' کو اپنی حیثیت کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔ چھوہارے کو اس بِد میں اک لازمی

شے سمجھا جاتا ہے۔ بِد کی تقسیم کا اک منظر دیکھئے:

''رمضو نائی نے چھوہارے اور مخانے تقسیم کئے اور جو بچ رہے تھے وہ مٹھیاں بھر بھر کر بچوں کی طرف پھینک دیے۔ بس پھر کیا تھا ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ بچے اُن پر ٹوٹ پڑے۔ ایک پر دوسرا اور دوسرے پر تیسرا۔ چھینا جھپٹی میں ایسی دھول اڑی کہ ہر چیز نظروں سے اوجھل ہوگئی۔''(۶)

یہی عمل دیہی کلچر کا اک بھرپور نمونہ ہے۔ آج کل تو یہ انداز نظر ہی نہیں آتا۔ اس ناول کی اک اور خوبی مقامی کرداروں کا ہجوم ہے مگر یہ ہجوم کہانی کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ اگرچہ کئی ناولوں میں بعض ایسے مواقع آتے ہیں کہ ناول نگار کرداروں سے مکمل انصاف نہیں کر پاتے مگر شبیر حسین شاہ نے ہر طرح کا کردار نہ صرف دکھایا ہے بلکہ کہانی میں اُس کو بھرپور انداز میں پیش بھی کیا ہے۔ اس حوالے سے شہزاد منظر کا کہنا ہے:

''اس ناول میں گاؤں کے تمام طبقات مثلاً جاگیردار، چھوٹے کسان، بڑھئی، لوہار، چکی والا، مسجد کا امام اور جاگیردار کے گماشتوں، پٹواری اور پیر و مرشد سب کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے۔''(۷)

ہمارے پنجاب کی ثقافت میں اک کردار میراثی کا ہوا کرتا تھا۔ یہ کردار شہری علاقوں سے تو غائب ہوا ہی تھا مگر اب گاؤں دیہات میں بھی یہ گم ہوتا جارہا ہے حالانکہ اس کے بغیر گاؤں دیہات کی کوئی شادی مکمل نہ ہوتی تھی۔ یہ اپنی آمد، جگتوں اور نقل کے انداز سے شادی میں شریک لوگوں کی تفریحِ طبع کا باعث بنتے تھے۔ سید شبیر حسین شاہ نے اِس کردار کا احوال علّو کی شادی کے موقع پر تفصیل سے بیان کیا ہے:

''شادی کی خبر پا کر کہیں سے تین میراثی بھی آ پہنچے...... تین کلاونتوں میں سے دو نے قمیص اتار دیں۔ ایک نے چھوٹا تھام لیا اور تڑاخ تڑاخ سے دوسرے کی پشت پر دو تین چھوٹے جما دیے۔ اب وہ بھانڈوں کے روپ میں چڑیا کا ریل کے سیکنڈ کلاس میں سفر اور ہم سفر میم سے دورانِ سفر میں جھپٹ کی نقل سنا رہے تھے۔ پھر تھانے میں چوکیدار کی ہفت روزہ حاضری، منشی کے روبرو گاؤں کے حالات کا تذکرہ۔ تھانیدار کے سامنے مکندری جھیور کے ہاں نقب زنی کی کہانی اور وقت پر واردات کی اطلاع نہ دینے پر مُرغا بننا اور آخری نقل گاؤں کے امام مسجد کی۔''(۸)

ان کرداروں کا تذکرہ اتنی زیادہ تفصیل سے بہت کم ناولوں میں ملتا ہے۔ یہ ہماری ثقافت کا حقیقی کردار تھا جو وقت کی بے رحم موجوں کی وجہ سے گم ہوگیا ہے۔ یہ کردار ہی نہیں بلکہ دیہی زندگی سے انسان دوستی، معصومیت اور محبت بھی ختم ہورہی ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے دیہی زندگی کے اس پہلو کے حوالے سے لکھا ہے:

''اُنس و محبت کا منبع غربت، غلامی، معذوری اور سفا کی کے زیرِ اثر سوکھ چکا تھا اور اس کی جگہ پر خود غرضی، طمع اور رقابت جلوہ فگن تھی۔ ہر فرد اپنے ادنی مفاد کی خاطر دوسرے کی گردن کاٹنے پر کمر بستہ تھا۔''(۹)

''جھوک سیال'' میں ہماری دیہی ثقافت کے کئی رنگوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض

باتیں جب اپنا مجموعی تاثر قائم کرتی ہیں تو ہمیں اک واضح تصویر نظر آتی ہے۔اگر چہ بعض ناقدین نے اس ناول کو پریم چند کی روایت کا ناول کہا ہے جس میں جا گیرداروں، پیروں اور سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں مقامی آبادی کا استحصال دکھایا گیا ہے مگر اس استحصال کو بیان کرتے ہوئے بھی بین السطور ہمیں مقامی ثقافتی رنگ بھی ملتے ہیں۔مثلاً شبیر حسین شاہ کپاس کی کاشت کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ سرکاری طور پر کسانوں کو امریکن کپاس کاشت کرنے کو کہا گیا تھا مگر چونکہ وہ مقامی اشیاء کی تیاری کے لیے موافق نہ تھی اس لیے لوگ چھپ کر دیسی کپاس کاشت کر لیتے۔انہوں نے مقامی سطح پر کپڑے وغیرہ کی تیاری کا جو تذکرہ کیا ہے وہ اس علاقے کی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔

> ''لوگوں کی ضروریاتِ زندگی معمولی تھیں۔لباس گاڑھے کا بنا جو گاؤں کی کھڈیوں پر بُنا جاتا ہے۔سُوت کاتنے کے لیے ہر گھر میں چرخہ موجود تھا۔اگر چہ سرکاری احکام کی رو سے صرف امریکن کپاس کاشت کرنے کی اجازت تھی،مگر ہر کسان دو چار کنال دیسی کپاس بھی کاشت کر لیتا جس کی روئی کات کر کھدر،کھیس،دریاں اور لحاف بنتے تھے۔''(۱۰)

یہاں چرخے کا ذکر ہوا ہے جو ہماری پنجابی ثقافت کا ایک اہم عنصر تھا اور پہلے گاؤں دیہات کے بیشتر گھروں میں موجود تھا، یہ چیزیں اب بھولی بسری داستان بن کر رہ گئی ہیں اور کہانیوں یا میوزیم میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔

''جھوک سیال'' میں سید شبیر حسین شاہ نے اگر چہ بعض کرداروں کے ذریعے لوگوں کی سفاکیت یا استحصال کی روش کو تو بیان کیا ہے مگر ان کے تناظر میں پنجاب کے دیہی علاقوں کی اِک خوبصورت تصویر بھی پیش کی ہے جو اس علاقے کی ثقافت کی ترجمان بھی ہے۔مثلاً تھانیدار کے سونے کے منظر میں اگر چہ صدرو چوکیدار کی مشقت تو دکھائی گئی ہے مگر جو پنکھا دکھایا گیا ہے وہ خاص ہمارے دیہی کلچر میں ملتا تھا:

> ''خود تھانیدار بغل کی کوٹھڑی میں جہاں ہاتھ سے کھینچنے والا پنکھا ٹنگا ہوا تھا اور جسے صدرو چوکیدار اونگھتا ہوا وقتاً فوقتاً بیدار ہو کر جھٹکے سے کھینچ رہا تھا،سو رہا تھا۔''(۱۱)

یہ انداز پنجاب کے اس گاؤں میں ضرور ملتا تھا کہ جہاں بجلی موجود نہ تھی اور ایک بڑا پنکھا جو کپڑے سے بنا ہوتا تھا، اسے چھت سے باندھ کر لٹکا دیا جاتا تھا اور ایک فرد اس پنکھے سے لٹکی ڈوری ہلاتا تھا تو پورے کمرے میں ہوا آتی تھی۔بعض لوگ تو سوتے ہوئے اپنے پاؤں کے انگوٹھے کے ساتھ اس ڈوری کو باندھ دیتے اور پاؤں ہلا ہلا کر بھی ہوا لیتے تھے۔مگر یہ عام گھروں میں تھا مگر تھانوں یا سرکاری دفاتر میں کہ جہاں بجلی نہ ہوتی وہاں کسی سائل یا مجرم کو اس پنکھے کو کھینچنے کی ذمہ داری سونپی جاتی تھی۔

ڈاکٹر خالد اشرف نے ''جھوک سیال'' پر لکھتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ جہاں جھوک سیال کے سیاسی، معاشی اور سماجی پہلو کو زیر بحث لاتے ہیں وہاں وہ اس علاقے کے لوگوں کی نفسیات کا بھی جائزہ لیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے:

> ''جھوک سیال کی تمام آبادی کی غربت اور سرکاری افسران وغیرہ سرکاری غاصبوں کے ہاتھوں مستقل لٹتے رہنے کے سبب گاؤں کے باسی جہاں پست ہمت بے حس اور نیم مردہ ہو گئے تھے

وہیں بداعتقادی اور تقدیر پرستی بھی ان کی سائیکی میں سرائیت کر گئی تھی۔"(۱۲)

یہ بداعتقادی اور تقدیر پرستی ہمارے کلچر میں زیادہ تر معاشی ناآسودگی اور مذہب سے لگا عدم واقفیت کی بنا پر زیادہ پروان چڑھتی ہے۔ بالخصوص دیہی علاقوں جہاں لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہو اور اُنہیں ہر بات پر اپنے پیر صاحب کی تابعداری کرنا ہوتی ہو تو ایسے ماحول میں بداعتقادی اور تقدیر پرستی کے ساتھ ساتھ پیر پرستی بھی لوگوں کے اذہان پر گرفت کر لیتی ہے۔ ایسے ماحول میں نہ صرف بڑے لوگ بلکہ علاقے کے مولوی بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوتے ہیں اور لوگوں کی نفسیات سے کھیلتے ہوئے اُنہیں تعویذ گنڈوں کی طرف مائل کرتے ہیں تاکہ ان کا اپنا پیٹ کا دھندہ بھی چلتا رہے۔ جھوک سیال سے دو تین مثالیں دیکھیے تاکہ اس کلچر کے استحصالی ٹولے کا وہ چہرہ بے نقاب ہو سکے جو شبیر حسین شاہ نے دکھایا ہے۔

"کچھ عورتوں کے ساتھ پانچ سال سے دس سال کے لڑکے بھی تھے جن کے سروں پر داہنی جانب ایک خاص زاویے پر لمبی لمبی چوٹیاں تھیں جو ایک پرانے رواج کے مطابق منت مان کر رکھی گئی تھیں کہ اگر بچہ زندہ رہا تو ایک مقررہ معیار گزرنے پر دربار کے سالانہ عرس کے موقع پر دربار کی چار دیواری میں کٹوائی جائیں گی۔"(۱۳)

یہ اعتقادات نسل در نسل چلتے ہیں کیونکہ یہ اُن لوگوں کی سائیکی بن چکی ہوتی ہے کہ پیر صاحب کی حکم عدولی یا منت کے چڑھاوے کا بروقت نہ چڑھانا کسی نقصان کا باعث ہو جائے گا۔ اس طرح پیر کی سالی کی شادی جس خاندان میں ہو رہی تھی اس کی کرامات بھی لوگوں تک پہنچی ہوئی تھیں کیونکہ اس طرح پیر صاحب کی کرامات کا بھرم بھی رہنا تھا کہ یہ اپنے ہی جیسے "نیک لوگوں" سے رشتہ داری کر رہے ہیں۔ اعتقاد کا پہلو دیکھیے:

"دولہا کے کسی جدامجد کے بارے میں مشہور تھا کہ مصلے پر نماز پڑھنے کے دوران میں نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ مریدوں کی اکثریت کا خیال تھا کہ بارگاہِ الٰہی میں وہ اس قدر مقبول تھے کہ باری تعالیٰ نے ان کی ارضی رہائش کو ناپسند فرما کر فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ پیر صاحب کو بہ نفسِ نفیس حاضر کرو تاکہ ہمیشہ ہمارے سامنے رہیں۔۔۔ اسی بنا پر ان کا گاؤں پیراں غائب کے نام سے مشہور تھا۔"(۱۴)

یعنی ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس علاقے کے تناظر میں ہمیں دیہی علاقوں میں موجود پیر پرستی اور بداعتقادی واضح طور پر نظر آتی ہے اور 'جھوک سیال' کے حوالے سے ڈاکٹر محمد افضال بٹ کا یہ کہنا بالکل درست محسوس ہوتا ہے:

"یہ ایک ایسے دیہاتی سماج کی کہانی ہے جہاں سیاسی غلامی کے ساتھ ساتھ معاشی و فکری غلامی کے جال نے پورے دیہی سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔"(۱۵)

اس فکری غلامی کے ساتھ ساتھ اس علاقے میں چھوٹے طبقے کو جس معاشی استحصال کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ سرکاری اہلکاروں کی جانب سے رشوت ستانی کا عنصر ہے۔ یہ ایسے علاقوں کا عمومی مزاج ہے کہ تھانیدار کی خدمت بڑھ چڑھ کر کی جاتی ہے کہ اس کے غیض وغضب سے بچا جا سکے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ بعض اوقات زمیندار یا پیر صاحب بھی اس کی خدمت کیے بغیر نہیں رہ سکتے اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے وہ تھانیدار کی خوب تواضع کرتے ہیں اور اس

تک مال بطور رشوت بھی پہنچاتے ہیں۔ یہی وہ سفاکی اور بے رحمی ہے جو اس علاقے کے تھانیدار کی نظر میں سب کو یکساں ایک قطار میں شمار کرتی ہے۔ ناول میں مصنف نے ہمیں دونوں طبقات کو سرکاری اہلکار یا تھانیدار کی خدمت کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ مثلاً جب جانوں کھڑل اور یارُو سنیال پٹواری کے سامنے پانی کی وارہ بندی کا مدعا بیان کرتے ہیں تو نمبردار ملک سیفو اُن کا تصفیہ پٹواری سے یوں کرواتا ہے:

> ''ایک بوری گندم...... پانچ سیر گھی...... دس مرلے سبز چارہ...... اور دو مرغیاں...... ان کا انتظام کر دو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چھ سے چار کیلے کرانا اور دو کیلے کا خراب دلانا میرا ذمہ۔''(۱۶)

اسی طرح عدالت شاہ جب تھانیدار کے شکنجے میں پھنسنے لگتا ہے تو اس کا خلیفہ امام بخش پیر صاحب کی طرف سے پانچ سو روپے اور دیگر سامان لے کر پہنچ جاتا ہے تاکہ پیر صاحب کا اقبال اور تقدس بلند رہ سکے۔ اس سامان کی تفصیل دیکھئے کہ جس سے اندازہ ہو گا کہ دیہی علاقے میں تھانیدار کا کتنا رعب ہوتا ہے اور اسے کیسے قابو کیا جا سکتا ہے:

> ''ٹانگے میں چار کنستر گھی، دو بوری گندم، ایک من چینی، دس سیر بادام اور اسی قدر پستہ اور کشمش اور ایک عدد بکرا رکھ کر خلیفہ امام بخش تھانے کے دروازے پر پہنچ گیا۔''(۱۷)

ان اقتباسات کی روشنی میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی رائے نہایت موزوں لگتی ہے:

> ''جھوک سیال'' میں دیہی زندگی کی سفاکی اور حسن دونوں موجود ہیں۔''(۱۸)

دیہی علاقوں کا ایک خاص وصف وہاں کی طرز بود و باش بھی ہوتی ہے جو مختلف انداز اور پہلو رکھتی ہے اُن کے کھانے، اُن کے برتن اور ان کے رہن سہن کا انداز بھی خاص ثقافت کی عکاسی کرتا ہے۔ 'جھوک سیال' میں جس علاقے کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے وہ زرخیز زرعی علاقہ ہے جہاں وہ تمام لوازمات موجود ہوتے ہیں جو کہ اس کی مناسبت کی مناسبت رکھتے ہوں۔ مثلاً لسّی بنانا، مکھن کاڑھ کر گھی بنانا وغیرہ اک خاص انداز رکھتا ہے:

> ''دودھ دوھیا جاتا اور مٹی کی چاٹیوں میں دن کی بچی ہوئی لسّی کی جاگ لگا دی جاتی۔ علی الصبح بلونے کے بعد مکھن حفاظت سے رکھ لیا جاتا اور گھرانے کی ضروریات کے مطابق لسّی رکھ کر باقیماندہ ضرورت مند لے جاتے۔ ہر جمعرات کو جمع شدہ مکھن کاڑھ کر گھی بنا لیا جاتا اور پھر گھر کی مالکن گھی رام دیال کی دکان پر منڈی کے نرخ سے چار چھ آنے کم پر بیچ آتی۔''(۱۹)

'جھوک سیال' کو ہم حقیقی معنوں میں پنجاب کی دیہی ثقافت کا مرقع کہہ سکتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس اس کی ایک تصویر ہے۔ اب اک اور پہلو کو بھی دیکھیے جو اس ثقافت کا الگ رنگ ہے:

> ''رات کو کھانا پکنے کے بعد وہ اُپلے جو پوری طرح جلے نہیں ہوتے تھے انہیں راکھ میں دبا دیا جاتا تھا اور تمام شب وہ سلگتے رہتے تھے اور بیشتر اوقات رات کے کسی حصے میں بیدار ہونے پر اکثر دہقان چلم پر اُپلوں کی آگ لگاتے اور لحاف میں گھس کر حقہ نوشی کرتے۔''(۲۰)

پنجابی دیہی کلچر کی مکمل تصویر اس وقت سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ وہاں کے کھانوں اور ان کے انداز کا ذکر نہ کیا جائے یہ اس کلچر کا وہ جمالی پہلو ہے جو دیکھتے ہوئے ہم وہاں کے باشندوں کا ہمہ قسم کا استحصال بھول جاتے ہیں۔ کھانے کے مختلف

انداز، خواتین کا کھانے بنا کر لے جانے کا انداز اور مہمانوں کی تواضع کے لیے کسی مُرغ یا بکرے کی ''قربانی'' دینا بھی کلچر کا خاصا ہے۔کہیں پر ہمیں سبز مرچوں کا اچار، کہیں بیل کا گوشت، تنور کی روٹیاں، کہیں گھی میں شکر ملا کر گرم گرم روٹیوں سے کھانا، کہیں لسوڑے کا اچار، چاٹی کی لسّی، غرض ہر طرح کے کھانے کے انداز اس ناول میں ملتے ہیں۔ مہمانوں کو سُرخ رنگ کا بانگیا ککڑ کھلانا اُس کی بہترین تواضع ہوتی تھی جبکہ مقامی کسانوں کا تذکرہ سید شبیر حسین شاہ یوں کرتے ہیں:

''دیہات میں دوپہر کے کھانے کا وقت متعین ہوتا ہے دھوپ نکلتے ہی رات کی بچی ہوئی باسی چپاتی کے ہر نوالے کو لسّی کا گھونٹ پی کر حلق سے نیچے اتارتے ہیں مگر دوپہر کو قدرے بہتر خوراک میسر آتی ہے۔اگر گیارہ بجے تک گھر لوٹ آئیں تو تندور کی تین موٹی موٹی گھی یا مکھن سے چپڑی ہوئی روٹیاں پیاز یا مرچوں کی چٹنی سے کھا لیتے ہیں ورنہ میلے دسترخوان میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور لسّی کا بھرا ہوا مٹی کا ڈولا جو پیتل کے چمکیلے کٹورے سے ڈھکا ہوتا ہے۔ بیویاں اور لڑکیاں سر پر اٹھا کر ان کے پاس کھیتوں میں لے جاتی ہیں جہاں تھوڑا سا وقت نکال کر وہ شکم پُری کر لیتے ہیں۔''(۲۱)

پنجاب اک زرعی علاقہ ہونے کی وجہ سے، اس کے دیہی علاقے کے لوگ اپنے مویشیوں سے بہت پیار کرتے ہیں اور اس کی خدمت دل و جان سے کرتے ہیں کہ یہ ان کے رزق کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں بالخصوص بھینس گائے وغیرہ لیکن جس علاقے کا ذکر سید شبیر حسین شاہ نے کیا ہے وہاں اعتقادات اور ٹوٹکوں کے سہارے مویشیوں کو تندرست رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔مویشی ہسپتال لے جانے کو بیشتر لوگ آمادہ نہیں ہوتے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ پیر فقیر کے تعویذ میں زیادہ قوت ہوتی ہے جو کہ مویشی ہسپتال میں نہیں ہوتی۔ یہاں جانوروں کے ڈاکٹر کو ڈنگر ڈاکٹر کہا جاتا ہے۔''جھوک سیال'' میں سید شبیر حسین شاہ دکھاتے ہیں کہ جب علاقے میں گل گھوٹو کی بیماری پھیلتی ہے تب بھی اس ڈاکٹر کی باتوں پر لوگ یقین نہیں کرتے اور بچاؤ کے ٹیکے نہیں لگواتے اور جب مویشی ہلاک ہو جاتا ہے تو اسے اپنے کسی قریبی جاننے والے کی سازش اور تعویذ گنڈوں کا اثر قرار دیتے ہیں مثلاً جب سکینہ کی بھُوری بھینس مر جاتی ہے تو اُس کا اعتقاد دیکھیے:

''سکینہ کو یقین تھا کہ بھینس کو ٹونوں ٹوٹکوں سے ہلاک کیا گیا ہے اور اس کی ذمہ دار تنہا شمو ہے۔جس نے تعویذ گنڈوں سے اپنے لڑکے کی بیماری کو بھینس کی طرف منتقل کر دیا تھا۔''(۲۲)

دوسری طرف یہ دیہی علاقوں بالخصوص راوی کنارے کا کلچر بھی ہے کہ وہاں مویشی چوری بھی عام ہے۔ بالخصوص بڑے بڑے زمیندار اپنے مزارعوں یا علاقے کے کمتر لوگوں کو اپنا زیرِ نگیں بنانے کے لیے اس طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں اور بعض اوقات تو اپنے سیاسی مخالفین یا حریفوں کے ہاں سے بھی مویشی چوری کروا دیے جاتے ہیں۔اس علاقے کا آج بھی مزاج ایسا ہی ہے ناول میں جب چوہدری علی محمد نے پیر عدالت شاہ کے مویشی چوری کروائے تو اس کا احوال کچھ یوں ملتا ہے:

''شب کی تاریکی میں پیر کے چار بہترین بیل اور تین نیلی کے علاقے کی مشہور و معروف نسل کی بھینسیں جو مریدوں کے گھروں سے ہانک لایا تھا، چوری ہو گئیں۔کول تار کی پختہ سڑک پر کھوج

گم ہو گیا۔ زمانے بھر کے ماہر کھوجی ہر سمت پھیل گئے مگر کھوج نہ ملنا تھا نہ ملا۔"(۲۳)

یہ علاقہ اپنے پیشہ ور رسّہ گیروں اور نقب زنوں کے حوالے سے مشہور تھا۔ سید شبیر حسین شاہ نے وہاں ایک عرصہ گزارا تھا لہٰذا اُن کے پاس ایسے چشم دید واقعات کا ذخیرہ تھا جو اس ناول میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کافی تھے۔ انہوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ راوی کنارے آباد نقب زن ایسے ماہر اور باکمال تھے کہ زمین دوز زیورات اور نقدی بھی سونگھ کر نکال لیتے تھے اور کوئی بھی مال برآمد نہیں کروا سکتا تھا۔

غرض یہ کہ "جھوک سیال" ایک ایسا ناول ہے جو شاید آج کے عام قاری تک محض نام کی حد تک تو پہنچا ہو مگر اس تک ناول پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں پہنچا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد تقریباً انچاس برس کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ اس ناول کے دوسرے ایڈیشن کی خصوصیت یہ ہے کہ سید شبیر حسین شاہ کی بیٹی مشہور گلوکارہ طاہرہ سید نے اس کے لیے پیش لفظ لکھا ہے جس میں انہوں نے اس ناول کی ڈرامائی تشکیل سے لے کر اس کی اشاعت تک کا احوال مختصراً بیان کیا ہے اور انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ کارِ سرکار کی بجا آوری کرتے ہوئے:

> "پنجاب کی دیہی زندگی کو جتنا قریب سے دل اور دماغ دونوں کے ساتھ میرے والد نے دیکھا شاید ہی کسی اور نے دیکھا ہو۔ میرا دعویٰ ہے کہ جس ایمان داری اور خلوص کے ساتھ انہوں نے پنجاب کے دیہاتوں کی کہانیوں کو جھوک سیال میں پیش کیا ہے کبھی کسی اور نے نہیں کیا۔"(۲۴)

اس دعویٰ کی دلیل ہمیں "جھوک سیال" کے مطالعے سے ملتی ہے جو رفتہ رفتہ قاری پر نئے معنی و مفاہیم کھولتا ہے اور نئے لکھنے والوں کے لیے کئی طرح کے نئے دروازے بھی وا کرتا ہے۔

طاہرہ سید کے دعویٰ کی تائید ملکہ پکھراج کی آپ بیتی کے اس اقتباس سے بھی ہو جاتی ہے کہ جس میں انہوں نے کارِ سرکار کے سلسلہ میں لودھراں، جھنگ، سمندری وغیرہ کے حوالے سے یادیں تحریر کی ہیں اور خود بھی اس علاقے کی منظر کشی اسی انداز میں کی ہے کہ جیسے سید شبیر حسین شاہ نے کی تھی۔

> "اب جھنگ تبادلہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس آؤ اور وہاں ہیر کا مقبرہ دیکھو......اس زمانے میں تحصیلدار کی بہت پوزیشن ہوتی تھی......ایک ایکڑ میں پرانی وضع کی اونچی چھتوں والی کوٹھی تھی جس کا بڑا کچا صحن تھا۔ کوٹھی کی موٹی موٹی کچی دیواریں جو اندر سے پکی تھیں تا کہ گرمی کے موسم میں کوٹھی ٹھنڈی رہے۔ صحن میں خوب چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ باہر گراؤنڈ کی طرف تین بھینسیں دو گھوڑے اپنے اپنے کمروں میں کھڑے تھے......مٹی ایسی بھربھری تھی کہ پاؤں زمین میں دھنس جاتا۔ دونوں وقت اس پر چھڑکاؤ ضروری تھا۔ کوٹھی کے باہر شیشم اور کیکر کے درخت تھے۔"(۲۵)

یہ وہ مشاہدے کی سہولت تھی جس نے "جھوک سیال" میں حقیقت کا رنگ بھر دیا تھا اور شبیر حسین شاہ نے ہر منظر، ہر واقعہ اپنی آنکھوں سے دکھایا تھا اور یوں دیہی پنجاب کا ایک دلکش مرقع اس ناول میں پیش کیا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، (کراچی: ورثہ پبلی کیشنز، ۲۰۲۱ء) طبع دوم ص ۸
۲۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء) ص ۲۵۵، ۲۵۶
۳۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۱۰۰
۴۔ محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، (لاہور: کتاب محل، ۲۰۱۹ء) ص ۱۶۶
۵۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۸۱ ۶۔ ایضاً، ص ۸۵
۷۔ شہزاد منظر، پاکستان میں اردو ادب کی صورت حال (اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۴ء)، مرتبہ: ڈاکٹر اسد فیض، ص ۱۰۰
۸۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۸۲، ۸۳
۹۔ خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، (لاہور: فکشن ہاؤس ۲۰۱۷ء) ص ۹۵
۱۰۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۱۲۵
۱۱۔ ایضاً، ص ۵۲
۱۲۔ خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، ص ۹۳
۱۳۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۲۴
۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۵
۱۵۔ محمد افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، ص ۲۵۰
۱۶۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۱۱۴
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۹۴
۱۸۔ ممتاز احمد خان، آزادی کے بعد اردو ناول: ہیئت، اسالیب اور رجحانات، (کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء) ص ۱۴۷
۱۹۔ سید شبیر حسین شاہ، جھوک سیال، ص ۱۲۵
۲۰۔ ایضاً، ص ۳۳۶ ۲۱۔ ایضاً، ص ۳۱۴
۲۲۔ ایضاً، ص ۳۸۶ ۲۳۔ ایضاً، ص ۲۶۷
۲۴۔ طاہرہ سید، پیش لفظ: جھوک سیال، ص ۴
۲۵۔ ملکہ پکھراج، بے زبانی زباں نہ ہو جائے، (کراچی: آجکی کتابیں، ۲۰۲۰ء) ص ۲۹۰